جناب مفتی احتشام الحق قاسمی صاحب
ریسرچ اسکالر شعبہ عربی (اے ایم یو) علی گڑھ (انڈیا)

خطبات ومواعظ تھانویؒ کا عوام وخواص کی اصلاح میں حصہ

سرزمین ہندوستان میں دیوبند کا علاقہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس نے خاص طور پر ہندوستان کو اور بالعموم سارے عالم کو کثیر تعداد میں بلند پایہ یگانہء روزگار علمی اور اصلاحی شخصیات فراہم کیں۔ جنہوں نے تدریس و تعلیم' وعظ وخطابت' تصنیف وتالیف اور اصلاح معاشرہ کے معاملہ میں بے پایاں محنتوں اور اخلاص کا ایسا زبردست نمونہ پیش کیا کہ سارا عالم ان کی محنتوں اور خلوص کا اعتراف کرتا ہے۔

"دیوبند" کی تیار کردہ حیرت انگیز علمی صلاحیتوں کی مالک اور اپنے سینہ میں قوم کیلئے بے لوثی واخلاص کا سمندر رکھنے والی شخصیتوں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ (م: ۱۹۴۳ء / ۱۳۶۲ھ) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ ایک ممتاز عالم دین' بلند پایہ بزرگ' حق گو وبیباک صوفی اور پرنویس مصنف تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے تفسیر' حدیث' منطق' عقائد' علم کلام اور تصوف میں ایک ہزار سے زائد تصانیف چھوڑیں جن میں سے کچھ صرف عوام کی اصلاح کیلئے لکھی گئیں تھیں جو آج بھی بے حد مقبول ومتداول ہیں۔ علامہ تھانویؒ نے جہاں عوام وخواص کی اصلاح کیلئے تعلیم و تدریس اور تصنیف وتالیف سے کام لیا وہیں انہوں نے وعظ وخطابت کو بھی خوبصورت انداز میں ذریعہ اصلاح بنایا۔ خطابت وتقریر کی اہمیت اور عوام وخواص کی اصلاح میں اس کے زبردست کردار کو ہر صاحب فہم بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اسلام سے قبل عرب جب جہالت کی زندگی گزار رہے تھے۔ تہذیب وتمدن سے کوسوں دور تھے۔ تب بھی ان کے پاس خطابت کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ ان کے قبیلوں میں خطیب کے ابھرنے پر خوشیاں منائی جاتیں۔ مسرت وفخر محسوس کیا جاتا' پھر مسلمانوں نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچایا۔ چنانچہ عہد نبوی' عہد خلفاء راشدین پھر دور بنی

امیہ اور اس کے بعد عباسی دور میں بھی ہم کو مستقل طور پر شعلہ بیاں' شیریں دہن اور فصاحت وبلاغت کے ماہر زبردست خطباء وواعظین کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جن میں سے بعضوں نے تو اس فن ہی کی مہارت کی بناء پر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور بہت سے نازک مسائل کو حیرت انگیز طور پر سلجھایا۔ فن خطابت دیگر فنون کی بہ نسبت زیادہ اہم اور نازک ہوتا ہے کہ اس کی تأثیر فوراً شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر مقرر وواعظ مثبت طرز فکر کا حامل ہو' مخلص ہو تو اس کے مثبت اور اچھے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور اگر وہ منفی ذہنیت کا حامل اور بد طینت ہو تو اس کا فن خطابت جو بھی غضب ڈھائے اور جو بھی تماشے دکھائے وہ کم ہے۔ اس فن کی اہمیت اور نزاکت دونوں کو علماء دیوبند نے سمجھا اور محسوس کیا۔ چنانچہ گذشتہ زمانے اور بہت حد تک اب بھی دارالعلوم دیوبند سے تیار ہو کر جو افراد نکلتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ اسلامیہ میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ بہت حد تک خطیبانہ صلاحیتوں کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ مادر علمی دارالعلوم دیوبند ہی کی تیار شدہ شخصیت مولانا اشرف علی تھانویؒ دیگر علمی صلاحیتوں کے ساتھ زبردست خطیبانہ صلاحیت کے بھی حامل تھے۔ انکی تقاریر ایمان واخلاص' اسلامی حمیت اور معنویت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ ان میں بے جا جوش وخروش بالکل نہ ہوتا۔ زبان وبیان پر شکوہ تھا۔ چونکہ زیادہ تر مخاطب علماء وخواص ہی ہوتے تھے اس لیے انکی تقاریر میں خالص علمی اور تحقیقی باتیں کافی تعداد میں ملتی ہیں۔ مزاح وظرافت کا عنصر اور دلچسپ واقعات بھی جسکی بناء پر سامعین ان کی طویل تقاریر کے دوران اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ ہم یہاں پر مختلف موضوعات کے تحت ان کے خطبات کا جائزہ لیں گے اور اس بات کا اندازہ کریں گے کہ ان کے خطبات نے عوام وخواص دونوں کی اصلاح میں کس حد تک حصہ لیا اور یہ کہ ان کی تقاریر آج کے زمانے میں کیا اور کس قسم کی اہمیت رکھتی ہیں۔

<u>تعلیم نسواں</u> : ہمارے معاشرے کی یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس میں جدید تعلیم وتربیت کا جو نصاب اور نظام ہے وہ خالصتہً مادہ پرستی پر مبنی ہے اس کو سیکھنے والے سکھانے والے سب کے سب مادہ پرستانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جب عصری تعلیم کے ادارے قائم کئے جاتے ہیں تو اس کے پیچھے بہت کم یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے سماج میں تعلیم یافتہ اور آئیڈیل قسم کے انسان پیدا

کئے جائیں جو سماج کیلئے مفید اور معاون ثابت ہوں بلکہ زیادہ تر یہ مقصد پوشیدہ' بلکہ عیاں ہوتا ہے کہ اس سے کتنا فائدہ ہوگا' کس کورس میں کتنا ڈونیشن (Donation) مل سکتا ہے' کس کورس کی زیادہ طلب اور ڈیمانڈ (Demand) ہے۔ مارکیٹ میں اس کی کتنی مانگ (Value) ہے؟۔ تعلیم گاہیں بجائے انسانی' اخلاقی اور اصلاحی اقدار کے مراکز بننے کے تجارت گاہیں بن چکی ہیں۔ نتیجتاً اس سے تیار ہونے والے اکثر افراد مادہ پرستانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی قائم کی ہوئی امیدیں پوری نہ ہونے کی صورت میں مایوسی وذہنی کرب انکا مقدر ہو چکا ہوتا ہے اور اس مادہ پرستی کے ماحول کا پروردہ انسان بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود حرص وہوس میں مبتلا ہو کر موجودہ خوشیوں اور سکون کو بھی خیرباد کہہ کر مزید کی تلاش میں آگے بڑھتے ہوئے جائز اور ناجائز کی تمیز کے بغیر کئی لوگوں کے جذبات کا خون کرتے ہوئے ناآسودگی ہی کے عالم میں قبر کے گڑھے تک پہنچ جاتا ہے۔ علامہ تھانویؒ کا کہنا تھا کہ کم از کم عورتوں کو اس مادہ پرستی کی تعلیم سے دور رہنا چاہیئے۔ اور اس کے نعم البدل یعنی دینی تعلیم سے آراستہ ہونا چاہیئے تاکہ اپنے خاندانوں میں سکون اور اطمینان کا ماحول قائم کیا جاسکے۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی بہ نسبت دینی تعلیم سے آراستہ لڑکیاں زیادہ سمجھ دار اور باسلیقہ ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ماں باپ اور شوہروں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ ان ہی کی کوتاہیوں سے عورتیں دینی تعلیم سے محروم ہیں۔ فرماتے ہیں: "عورتوں کے بارے میں اول تو باپ کے ذمہ فرض ہے کہ ان کو دین سے باخبر کرے اگر وہ جاہل رکھے تو شوہر کے ذمہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تعلیم دے۔ بتلایئے اس فرض کو کتنے شوہر ادا کرتے ہیں؟۔ پھر شکایت کی جاتی ہے کہ عورتیں جاہل ہیں۔ اے صاحب! تم نے خود ان کو جاہل رکھا ہے اگر تم ان کو تعلیم دیتے تو وہ کیوں جاہل رہتیں اور اگر کسی کو تعلیم نسواں کا اہتمام بھی ہوا تو وہ ان کو انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں...... میں بقسم کہتا ہوں کہ عورتوں کو دین کی تعلیم دے کر دیکھو کہ اس سے ان میں عقل وفہم وسلیقہ وانتظام دنیا کا بھی کس قدر پیدا ہوتا ہے جن عورتوں کو دین کی تعلیم حاصل ہے۔ عقل وفہم میں ان کا مقابلہ وہ عورتیں کبھی نہیں کرسکتیں جو "ایم اے' میمیں" ہو رہی ہیں۔ ہاں بے حیائی میں وہ ان سے ضرور بڑھ جائیں گی اور باتیں بنانے

میں بھی انگریزی پڑھنے والیاں شائد بڑھ جائیں مگر عقل کی بات دیندار عورتوں ہی کی زبان سے زیادہ نکلے گی اور تعلیم دین کی آسان ترکیب یہ ہے کہ عورتیں لکھ پڑھ نہ سکیں توانکو روزانہ دوچار مسئلے ان کی ضرورت کے بتلادیا کریں اور کوئی کتاب عقائد کی اور مواعظ ونصائح کی اور حکایات صلحاء کی ان کو سنادیا کریں, انشاء اللہ چندروز میں بدوں پڑھے لکھے ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گی" (۱)

غیر شرعی اور حرام نوکریوں کے مسئلہ کا حل : ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں پر کئی مذاہب کے پیروکار بستے ہیں۔ جسکی وجہ سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بہت سی ایسی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنکی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اگر ان کا سختی اور تشدد کے ساتھ بائیکاٹ کیا جائے تو ہماری زندگی دوبھر ہو جائیگی ان معاملات میں سے ایک مسئلہ غیر شرعی ملازمت کا بھی ہے کہ اگر کوئی آدمی ایسی ملازمت پر ہو جو شرع کی رو سے غلط اور ناجائز ہے جیسے سودی بنکوں کی ملازمت وغیرہ تو ایسا آدمی کیا کرے ؟ اگر ملازمت چھوڑتا ہے تو زندگی کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سخت دشواریوں کا اندیشہ ہے اور اگر نہیں چھوڑتا تو ایک حرام کام کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ تھانویؒ کا خیال ہے کہ وہ ملازمت نہ چھوڑے، البتہ جائز اور باوقار ذریعہ معاش کی تلاش کرتا رہے۔ اگر مل جائے تو پھر اس ملازمت کو چھوڑ دے ورنہ نہیں چنانچہ فرماتے ہیں : "میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی نوکری ایسی بھی ہو کہ نامشروع ہو اور مشروع نہ ملتی ہو تو نہ چھوڑو، ہاں اپنے کو گنہگار سمجھو۔ اگر کوئی کہے کہ امر نامشروع کے چھوڑنے سے منع کرتے ہیں تو صاحبو! ہم نامشروع کے چھوڑنے سے منع نہیں کرتے بلکہ ایک نامشروع کو سپر بناتے ہیں بہت سے نامشروع کیلئے یعنی اس وقت اگر چھوڑے گا نہ معلوم کتنے معاصی میں مبتلا ہو گا کہیں چوری کرے گا، جوا کھیلے گا، جھوٹی گواہی دیگا، لوگوں کا قرض لے لے کر مارے گا اور نہ معلوم کیا کیا آفتیں کرے گا۔ پھر جب آگے بڑھے گا تو یہ خیال ہو گا کہ اے نفس تو اس قدر معاصی میں مبتلا ہے تیری نجات کیا ہو گی بس جب نجات نہ ہو گی تو الگ کرو سارا جھگڑا اور خوب جی کھول کے جو کچھ ہو سکے کر لو۔ اے لیجئے! ایک نامشروع کے ترک سے کفر کی حد تک پہنچ گیا۔ اب بتایئے کہ ایک نامشروع میں مبتلا ہو کر مسلمان رہے یا یہ اچھا ہے کہ ایک نامشروع کو چھوڑ کر بہت سے نامشروع میں بھی مبتلا ہو اور پھر مسلمان بھی نہ رہے ؟ (۲)۔

بعض دینی کام بھی شیطان کے بہکاوے کا نتیجہ ہوتے ہیں : قرآن کریم میں انسانوں کا سب سے بڑا دشمن شیطان کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ ملعون ہر انسان کے ساتھ مستقل طور پر لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس کو گناہوں کی دلدل میں گلے گلے تک اتار دے۔ جتنی نیک اور پارسا شخصیات ہوتی ہیں ان کا شیطان اسی حساب سے زیادہ شیطانی صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اور ان پر کسی طرح بھی بس نہ چلے تو دینی رنگ اور مذہبی انداز ہی میں ان کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے وہ اس طرح کہ آدمی سمجھتا ہے میں نیک کام کر رہا ہوں اور ہوتا ہے وہ شیطان کا مکر تاکہ وہ شخص دیگر اہم کاموں سے ہٹ جائے بالکل اسی طرح جیسے ہم ایسے بچہ کو غبارہ دے کر بہلاتے ہیں جو سو کا نوٹ مانگنے کی ضد کر رہا ہو۔ فرمان تھانویؒ ہے :"بعض لوگوں پر حج فرض نہیں ہوتا اور ان کو حج کی ہوس ہوتی ہے اس میں بھی نفس و شیطان کی یہ تسویل (وسوسہ اندازی) ہوتی ہے کہ ایک نفل کی تحصیل میں بہت سے فرائض برباد ہوتے ہیں کیونکہ بہت لوگ حج کے سفر میں نمازیں چھوڑ بیٹھتے ہیں اور رفقاء سے جنگ و جدال اور سب و شتم میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعضے اس لئے حج کرتے ہیں کہ حاجی صاحب بن جائیں گے لوگ تعظیم سے پیش آئیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کیلئے حضرت مسعود فرماتے ہیں :-

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید — معشوق درا یجاست بیائید بیائید

یعنی اے قوم حج میں گئی ہوئی تم کہاں ہو کہاں — معشوق تو یہاں ہے آؤ یہاں آؤ

یعنی محبوب حقیقی کی رضا حالات خاصہ میں وطن رہنے میں ہے۔ اس لئے کہ حج تم پر فرض نہیں ہے اور حج نفل ادا کرنے میں بہت سے واجبات و فرائض ترک ہوتے ہیں۔ غرض شیطان ہر شخص کو اس کے مذاق کے موافق دھوکہ دیتا ہے (۳)۔ اسی طرح علامہ تھانویؒ کہتے تھے کہ اگر کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ جو دینی کام ہم تنخواہ لے کر کر رہے ہیں اس کو بغیر تنخواہ کے کریں گے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے اس لئے کہ اس طرح تنخواہ چھوڑنے کے بعد آہستہ آہستہ پابندی ختم ہو گی اور پھر ساری ذمہ داری بھی ختم۔

غصے کے نقصانات سے بچنے کا نسخہ : غصہ انسانی فطرت کی ایک زبردست کمزوری ہے اور شیطان اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اکثر بڑے بڑے ہنگامے اور فتنے کھڑے کر دیتا ہے پھر بعد میں

لوگ پچھتاتے ہیں کہ کاش ہم نے اپنے غصے پر قابو پالیا ہوتا، جبکہ اس پر قابو پانا زبردست قوت برداشت اور ضبط کی بات ہوتی ہے، جو ہر عام انسان کے بس کی بات نہیں' مگر ہم اس بات کا ضرور خیال رکھ سکتے ہیں کہ غصہ کے عالم میں ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جائے کہ اس پر پچھتانا پڑے۔ علامہ تھانویؒ نے اس کیلئے ایک مفید طریقہ بیان فرمایا ہے جس کے استعمال سے ہم بہت حد تک غصہ کے نقصانات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں :"میں غصہ کے بارے میں ایک گر بتلاتا ہوں جو عملی علاج ہے جو دستور العمل بنانے کے لائق ہے وہ یہ کہ غصہ آتے ہی فوراً نافذ کرنا شروع نہ کردے۔ ذرا ٹھہر جائے اور جس پر غصہ آیا ہے اسکو اپنے سامنے سے ہٹادے یا خود وہاں سے ہٹ جائے جب جوش جاتا رہے اب فیصلہ کرے کہ اس شخص کو کیا سزا دی جائے "(۴)۔

نااتفاقی اور عدم اتحاد کا بنیادی سبب : فرماتے ہیں :"آج کل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں اتفاق رہے۔ اس کیلئے تقریریں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں تحریری مضامین بھیجے جاتے ہیں، جلسے کیے جاتے ہیں' لیکن جو نااتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان۔ اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نااتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا جس کو چاہا کہہ دیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جسکی حد نہیں اور پھر غضب یہ کہ بے حیا کبھی تھکتی بھی نہیں۔ دوسرے اعضاء مثلاً سر' آنکھ' کان' ہاتھ' پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضاء زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے "(۵)۔

اتفاق واتحاد کی جڑ : "خلوص اور تواضع "یہی دونوں چیزیں ہیں جن سے ہم میں اتفاق پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو لاکھ چیخئے چلائیے کہ اتفاق کی یہ اہمیت ہے اور اتفاق نہ ہونے کی یہ مضرتیں ہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم میں سے چند لوگ جو اتفاق کی دعوت دیتے ہیں وہ خود اس راز سے واقف نہیں اور اگر واقف ہیں بھی تو ان صفات سے متصف نہیں۔ انہی لوگوں کیلئے علامہ تھانویؒ اپنے دلچسپ انداز میں فرماتے ہیں :"میں سچ کہتا ہوں کہ آج کل جو تقریروں میں کہا جاتا

ہے کہ اتفاق کرو' اتفاق کرو' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں۔ ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی رائے دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کیلئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میری اتباع نہ کریگا تو میں اس کی اتباع کر لوں گا (بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے) حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے۔ اتفاق کی جڑ "تواضع" ہے۔ یہ ایک حجرہ نشین صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں (٦)۔

آپس میں محبت اور خلوص پیدا کرنے کا راز : اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت ساری ناچاقیوں اور اختلافات کا بنیادی سبب نہایت ہی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ جن کے نظر انداز کرنے اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنے سے وہ تمام اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ مگر اسلامی تعلیمات سے دوری کی بناء پر ان قیمتی ہدایات سے ہم ناواقف ہیں جو ہماری زندگی کو باغ و بہار اور مسرتوں سے بھرپور بنا سکتی ہیں۔ علامہ تھانویؒ ان ہدایات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اور لیجئے اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو اور یہ جڑ ہے محبوبیت باہم دیگر کی چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے :"المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده" مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں یعنی کسی کو اس سے ضرر و اذیت نہ پہنچے۔ یہ تو کلیہ ہے پھر اس کی جزئیات کی عملی اور علمی طور سے ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ انتہا کو پہنچا دیا کہ اگر کوئی مسلمان بھائی سوتا ہو اور تم کو اٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت ہو تو آہستہ سے اٹھو اور آہستہ سے جوتے پہنو۔ آہستہ سے کواڑ کھولو۔ اگر بات کرو آہستہ سے کرو۔ یہ سب حضور ﷺ نے کر کے دکھلایا" (٧)۔

کیا "مال و اسباب" ہی ہماری خوشیوں کے ضامن ہیں ؟: دین پر صحیح اور مکمل عمل سے نہ صرف یہ کہ ہماری آخرت بہتر ہوتی ہے بلکہ ہماری دنیاوی زندگی کا مزا بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہم جو کھاتے ہیں' پیتے ہیں' سوتے ہیں اور زندگی کے دوسرے معمولات ہیں ہمارے دین پر عمل کرنے سے ان معمولات میں بھی ایک فرحت اور نشاط کی کیفیت رہتی ہے جو کثرت معاصی سے اٹھالی جاتی ہے۔ کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین پر مکمل عمل کرنے پر مال اور اسباب زندگی زیادہ

حاصل نہیں کئے جاسکتے تو جب اسباب ہی صحیح طور پر میسر نہ ہوں تو زندگی کا مکمل سکون کس طرح حاصل ہوگا؟ اس شبہ کا جواب علامہ تھانویؒ کے مخصوص متاثر کن اور شیریں بیان میں ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں: "خوب سمجھ لیجئے کہ لطف زندگانی کا مدار مال پر نہیں بلکہ نشاط طبیعت پر ہے...... وہ غریب جو دونوں وقت چنا اور مٹر ہضم کر لیتے ہیں ان رؤساء سے ہزار درجہ افضل ہیں جن سے دو چپاتی بھی ہضم نہیں ہوتی کیونکہ غرباء بھوک کے وقت کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد محنت ومشقت ریاضت وغیرہ کرتے ہیں تو سب ہضم ہو جاتا ہے اور رؤساء تو کمیٹی اور مشورہ کر کے کھاتے ہیں ان کو خاک بھی کھانے کا لطف نہیں آتا۔ اسی طرح اور کاموں کے اندر بھی ان کو نشاط روح حاصل نہیں ہوتا...... میں ببانگ دہل کہتا ہوں کہ لطف زندگانی جو کچھ ہے دیندار کے پاس ہے۔ دنیادار کے پاس کچھ نہیں اور اگر کسی دنیادار کو لطف میں دیکھا بھی جاتا ہے تو وہ یا تو دنیا کا اثر نہیں بلکہ اس حصہ دین کا اثر ہے جو اسکا حاصل ہے اور جس قدر اسکے دین میں کمی ہے اتنا ہی لطف بھی کم ہے اور یا اسکی ظاہری حالت سے دھوکا ہوتا ہے۔ اندرونی حالت کی تفتیش کی جاوے تو پریشانی ہی ثابت ہوگی اور یا اس نے حقیقی لطف دیکھا ہی نہیں اس لئے وہ اس صورت لطف کو لطف سمجھتا ہے" (۸)۔

راحت وسکون کا راز: سکون اور اطمینان کا تعلق صرف "دماغ اور دل" سے ہوتا ہے۔ اسباب اور مال ودولت ضمنی چیزیں ہیں۔ صرف ظاہری اسباب ہی میں سکون واطمینان پوشیدہ نہیں رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آئے دن مالدار اور شہرت وعزت رکھنے والی شخصیات کی خودکشیوں کی خبریں پڑھنے کو نہ ملتیں۔ کروڑوں املاک کے مالک افراد کو Sleeping Pulses (نیند کی گولیوں) کا استعمال کرنا نہ پڑتا۔ اس سلسلہ میں علامہ تھانویؒ کا یہ منطقی بیان بے حد معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں: "لوگ آج کل سامان راحت کو مقصود سمجھتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو جائے اور سامان راحت اس کے پاس سب کچھ ہو تو کیا اسے کچھ راحت ہوگی؟ ہرگز نہیں اور کچھ نہیں۔ اور اگر ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہوا ہو اور چند روز کے بعد وہ رہا ہو جائے تو گو اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہیں مگر دیکھ لیجئے کہ رہائی کی خبر سُن کر اس کے یہاں کیسی عید آئے گی۔ معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان راحت اور چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے

پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو اور میں فقط دلیل ہی نہیں بلکہ مشاہدہ سے بھی دکھلاتا ہوں کہ آپ ایک کامل دیندار شخص کو لیں مگر ہم جیسا دیندار نہیں بلکہ واقع میں کامل دیندار ہو۔ اور ایک نواب یا رئیس کو لے لیں پھر انکی نجی حالت کا موازنہ کریں تو واللہ ثم واللہ وہ دیندار تو آپ کو سلطنت میں نظر آئے گا اور یہ نواب و رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا۔ مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں، باقی میں سامان سے منع نہیں کرتا بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں۔ اگر دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ شریعت نے ضعفاء کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے، بلکہ بعض عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ بھی جمعیت قلب کے لئے کچھ سامان رکھتے ہیں مثلاً کپڑوں کے چار جوڑے اور سال بھر کا اناج، سو دین کی نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مضائقہ نہیں مگر عبد الدینار (دینار و روپیہ کا غلام) عبد الدرھم (درھم کا غلام) ہونا برا ہے "(۹)

اسلامی اوقاف واملاک کی بربادی کی ایک وجہ : آج کے زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت میں علم و ہنر، جفاکشی و محنت اور ہمدردی و خلوص کا فقدان پایا جاتا ہے اور اس پر ان کے ہندوستان میں اقلیت میں ہونے اور صحیح سیاسی رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ان کیلئے باعزت ذرائع معاش کا حصول ایک مشکل مسئلہ بن چکا ہے۔ اور زندگی کی ضرورتیں ایسی ہیں کہ وہ ہر حال میں منہ پھاڑے کھڑی رہتی ہیں۔ چنانچہ ان کی تکمیل کیلئے جب کوئی سہل راستہ نظر نہ آیا تو بد طینت لوگوں کی نظریں مذہبی عمارتوں اور اسلامی اوقاف کی طرف بھی اٹھنے سے نہیں چوکیں۔ چنانچہ بیسیوں قبرستان اور اسلامی اوقاف اسی ذہنیت کے حامل بے غیرت افراد کے ہاتھوں خرد برد ہو کر آج مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ چہ جائیکہ ان سے مسلمانوں کیلئے رفاہ کا کام لیا جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان املاک اور ان کے اہم عہدوں پر بھی میراث کا مسئلہ چل پڑا۔ اگر باپ قاضی تھے تو اولاد چاہے لفظ "قضاء" کے صحیح معنی بھی نہ جانتی ہو وہی ان کے بعد اس عہدہ کی موروثی حقدار قرار پائی۔ اگر والد شیخ تھے تو بیٹا چاہے دنیا بھر کی نالائقیوں سے متصف ہو مگر ان کے بعد شیخ ہونے کے حقدار وہی ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے اہم معاملوں میں بھی ہم نے ذاتی مفادات کیلئے وقتی سلجھاؤ کیلئے اور بعض

جگھوں پر بے جا مروت کی وجہ سے نااہلوں کو اہم عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز کر دیا جبکہ اہل اور پر خلوص افراد کی بھی کچھ کمی نہ تھی چنانچہ اس کا نتیجہ ہم آج اچھی طرح بھگت رہے ہیں۔اس کے باوجود ہماری نظر ادھر نہیں جاتی اور ہم اس حقیقت سے نظریں چراتے ہیں کہ کوئی بھی اہم عہدہ "خیرات" یا "بھیک" نہیں ہوتا ہے کہ ہمدردی کے جذبہ کے تحت کسی کے محتاج ہونے کی وجہ سے اسکو دیدیا جائے یا وہ کوئی بیچنے کی چیز نہیں ہوتی کہ جس نے صحیح بولی لگائی اس کو فروخت کر دیا جائے ،بلکہ وہ ایک طرح کی امانت ہوتا ہے جس کی ادائیگی اس کے اہل کو کرنا واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ اس پر ساری قوم کی عزت اور وقار کا انحصار ہوتا ہے۔ سینکڑوں افراد کے مفادات اور ضرورتیں وابستہ ہوتی ہیں اور غیر اہل کے ہاتھوں میں جانے پر ان کے ضائع ہونے کا مکمل خطرہ رہتا ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب قائم ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا :"اذا وسد الأمر الی غیر أهله فانتظر الساعة" جب کوئی بھی معاملہ اس کے غیر اہل (نااہل) کے سپرد کر دیا جانے لگے گا تو سمجھ لو کہ قیامت آنے ہی والی ہے"۔ یعنی جب اس طرح کے معاملے کثرت سے ہونے لگیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قیامت کا وقت قریب ہے۔ مولانا تھانویؒ نے اپنی کئی تقاریر میں اس معاملہ پر بے حد افسوس کا اظہار کیا۔وہ فرماتے ہیں :"آجکل یہ مصیبت عام ہو رہی ہے کہ قضاء اور خطابت میں بھی میراث چلنے لگی کہ قاضی کی اولاد قاضی اور خطیب کی اولاد خطیب۔ چاہے علم اور دین سے کورے ہی ہوں...... اسی طرح آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے۔ چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں۔اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے۔ آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھلا کر خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے (۱۰)۔

بقول علامہ اقبالؒ ؎

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی اور بھڑووں میں صرف ہوتی

ہے۔ ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہورہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کیلئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے انکی اولاد ہی اسکی متولی ہوتی ہے خواہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا اور اس طرح ہزاروں اوقاف برباد ہوگئے" (۱۱) (اور ہو رہے ہیں)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں طمع و خوف : "نیکیوں کی ترغیب دینا اور برائیوں سے روکنا" بالعموم مسلمانوں کا اور بالخصوص اہل علم کا فریضہ ہے جس کی ادائیگی دونوں پر لازم ہے مگر جس طرح دیگر فرائض کی ادائیگی میں ہم کوتاہیوں کا شکار ہیں اسی طرح اس فریضہ میں بھی طرح طرح کے اندیشوں کا شکار ہیں۔ خاص کر اس وقت جب کسی شخص سے ہمارے مفادات وابستہ ہوں، امیدیں متعلق ہوں یا کسی قسم کا خوف ہو تو اس ذمہ داری کے نبھانے میں اور بھی زیادہ نرمی برتی جاتی ہے جسکے علامہ تھانویؒ سخت خلاف تھے۔ فرماتے ہیں : "روکنے کے تو کیا معنی؟ اگر کہیں طمع یا خوف ہو تو اور اسکی تقریر و تائید کرتے ہیں، کہیں دوستوں کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ، کہیں طمع و توقع کا خیال رہتا ہے کہیں محسنوں کے احسان کا اثر ہوتا ہے، بہر حال طمع میں آدمی بہت ڈھیلا ہو جاتا ہے اور حالت بہت گر جاتی ہے...... چنانچہ عام طور پر یہ وباء پھیلی ہوئی ہے کہ ایسا نہ ہو خفا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے ایسا طریقہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا نہ نکالو، جس سے کوئی خفا ہو جائے اور اگر تمھارے اچھے طریقہ پر بھی کوئی خفا ہو جائے تو یہ اس کا فعل ہے تمھارا فعل نہیں"۔ (۱۲)

خواص کا وعظ و نصیحت میں کوتاہی برتنا : خطابت و تقریر اور وعظ و نصیحت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بے حد مؤثر اور فعال ذریعہ ہے جس کو تمام انبیاء کرامؑ نے اپنایا اور اس کے ذریعہ سے وحدانیت و للھیت کی تعلیم دی، مگر آج بہت سے اہل علم صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اس ذمہ داری کی ادائیگی سے صرف یہ سوچ کر پہلو تہی کرتے ہیں کہ یہ کام کم علم والوں کا ہے ہمارا کام صرف درس و تدریس ہے۔ علامہ تھانویؒ کے خیال میں ایسا سوچنا بالکل غلط ہے اور یہی سوچ سماج میں پیدا شدہ بہت سے مسائل کی جڑ ہے۔ فرماتے ہیں : "ہم لوگ جو لکھے پڑھے کہلاتے ہیں بس طالب علموں کے پڑھانے کو بڑی معراج سمجھتے ہیں مگر جو غایت اصلی اور غرض صحیح تعلیم و تعلم سے ہے اور جو

انبیاء علیھم السلام کا خاص کام ہے یعنی تبلیغ واشاعت جو بذریعہ وعظ ہوتی ہے اس کا کہیں پتہ بھی نہیں بلکہ جو اساتذہ علامہ کہلاتے ہیں وہ اسے موجب تذلیل وتحقیر باعث استخفاف اور ننگ وعار سمجھتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے۔بس جی تم نے اسے جاہلوں کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا تو پھر جاہلوں ہی نے اسے لے لیا۔ جنہیں معانی کی تو کیا خبر ہوتی الفاظ تک درست اور صحیح ادا نہیں کر سکتے۔ لوگوں نے وعظ کہتے دیکھ کر انہیں عالم سمجھ لیا اور عالم سمجھ کر بعد وعظ کے فتوے پوچھنے شروع کر دیے۔ یہ بیچارے عالم تو تھے نہیں مگر یہ کہتے شرم آئی کہ مجھے مسائل نہیں معلوم مجبوراً جو جی میں آیا بتا دیا اور غلط سلط فتوے دے دیا"۔(۱۳)

واعظ کیلئے عمل کی ضرورت : وعظ ونصیحت میں اثر آفرینی عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔بے عمل واعظ وناصح کا اثر لوگ قبول نہیں کرتے۔اور الٹا بدظنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علامہ تھانویؒ فرماتے ہیں :" عمل وہ چیز ہے کہ نصیحت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ایک جگہ میں گیا۔وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے اور ماسٹر اس کا ہندو تھا۔وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر کی بڑی تعریف کی کہ یہ روز پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کیلئے لڑکوں کو مسجد لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کا نماز پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں پڑھتے،اس لئے ضرورت ہے کہ نماز پڑھوانے والا مسلمان ہونا چاہیئے اور حقیقت میں یہی ہوتا ہے کہ علماء باعمل کا جو اثر ہوتا ہے وہ علمائے بے عمل کا نہیں"(۱۴)۔

ایمان کے آخری درجہ سے بھی لاپرواہی : "نہی عن المنکر" کیلئے احکام یہ ہیں کہ اگر کسی کو طاقت ہو تو بُرائی کو ہاتھ سے روکے ورنہ زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے بُرا سمجھے اور ان لوگوں سے دوری اختیار کرے، مگر موجودہ مسلم معاشرے میں ہاتھ اور زبان سے روکنے کا مسئلہ تو دور کی بات ہے دل میں برا سمجھنے کا احساس بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہم لوگوں میں سے اکثر تو خود معاصی میں مبتلا ہیں اور جو کچھ حد تک مذہبی حمیت رکھتے ہیں ان میں بھی اس شعور کا فقدان ہے۔ مولانا تھانویؒ اس معاملہ میں کافی تشویش رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں :"حدیث میں آیا

ہے کہ حق تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو کسی بستی کے الٹ دینے کا حکم دیا کہ یہ لوگ بہت حد سے نکل گئے ہیں ان کا تختہ الٹ دو۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ خداوندا اس بستی میں ایک شخص ایسا ہے جس نے عمر بھر بھی کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ کیا اس سمیت الٹ دوں فرمایا ہاں اس سمیت ہی الٹ دو کیونکہ اس نے بظاہر کوئی گناہ نہیں کیا، مگر گنہگاروں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر بل بھی نہیں پڑا وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی اور محبت کے ساتھ ملتا رہا جیسا دوستوں کے ساتھ ملا کرتے ہیں تو یہ کیسی محبت ہے کہ ہمارے دشمنوں پر بھی غصہ نہ آئے، اس لئے وہ بھی انہی کے مثل ہے اس کو بھی الٹ دو۔

صاحبو! اس بلاء میں ہم لوگ بھی گرفتار ہیں۔ ہمارے ملنے والوں میں بھی بعض مبتلائے معاصی ہیں اور ہم ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ملتے ملاتے ہیں۔ ہاں ایک صورت میں اس کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ کسی سے اضرار (تکلیفوں کے پہنچنے) کا اندیشہ ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو، اس کو سکوت کی اجازت ہے باقی جس کو ہمت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہیں ہے، بلکہ اس کیلئے یہ حکم ہے۔ یبنیٰ اقم الصلوۃ وأمربالمعروف وانہ عن المنکر واصبرعلیٰ مااصابک ان ذالک لمن عزم الامور" (ترجمہ: اے میرے بیٹے نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور اس پر تم کو جو نقصان پہنچے اس کو برداشت کرو۔۔۔۔۔۔۔ اس کو چاہیئے کہ صاف صاف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور جو خطرہ پیش آئے اس کا تحمل کرے" (۱۵)

<u>آج کل کی پیری مریدی</u> : "شخصیات پرستی" کے معاملہ میں ہندوستان کا ماحول اور یہاں کی تہذیب اپنی امتیازی شان رکھتی ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک اسی ماحول میں رہنے کیوجہ سے مسلمان جہاں اور بہت سی باتوں سے متاثر ہوئے وہیں "شخصیات پرستی" کا معاملہ بھی ہے، جسکو ہم موجودہ دور کی پیری 'مریدی میں واضح شکل میں دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں مرید اپنے دنیاوی مفادات کے حصول میں تقویت کیلئے کسی شیخ سے بیعت کرتے ہیں وہیں نام نہاد شیخ بھی اپنے نام ونمود اور مادی مفادات کے حصول کیلئے ان کو بیوقوف بناتے ہیں ان کو مخصوص رقومات کے عوض دنیاوی کاموں میں برکتیں عطا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عذاب قبر سے نجات اور آخرت میں بخشش کا بھی وعدہ کرتے

ہیں بلکہ کچھ عرصہ قبل تو یہاں تک سنا گیا کہ بعض شیوخ نے ایک مخصوص رقم کی ادائیگی پر پانچ سال اور دس سال کی نمازوں کی معافی کی دستاویز بھی دینا شروع کر دیا اور اسی طرح متعینہ رقم کی ادائیگی پر جنت کا ٹکٹ بھی۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ علامہ تھانویؒ درمندانہ انداز میں فرماتے ہیں :

"بس آجکل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوالیں گے۔ لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے۔ گو اسکے بعد کتنے ہی گناہ کر لیں' چنانچہ اسکے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لیے ہیں کہ فلاح بزرگ سے منقول ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائے گا تو دنیوی مقاصد میں ہم کو سہولت ہو گی۔ مقدمات میں دعا اور تعویذ گنڈے کروالیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی" اسکے بعد پیروں کی بد حالی اور عوام سے مادی استفادہ کی غرض سے پیری اختیار کرنے کے احوال بیان کر کے کہتے ہیں : "یاد رکھو کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں، یہ سراسر بے دینی ہے"۔

بدعت کی روک تھام کا خوبصورت طریقہ : سماج میں مروجہ مختلف بدعات، غلط رسوم وعقائد بیان کر کے فرماتے ہیں : "ان تمام اعتقادات کے موجد یہ مسجد کے "مُلا" ہیں، انہوں نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جس میں آمدنی ہو، ان ملاؤں کی حرص اس قدر ہوتی ہے کہ ان کو جائز ناجائز کی بھی کچھ تمیز نہیں ہوتی...... اسی لئے ایصال ثواب میں ایسی شقیں لگائی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کچھ کسی کو دے ہی نہ سکے۔ مثلاً کھانا پانی سامنے رکھ کر پنج آیت وغیرہ پڑھنا کہ عوام تو خود پڑھنا جانتے نہیں لامحالہ انہی کو بلاویں گے اور جب بلادیں گے تو حصہ بھی ضرور ملے گیا۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جہاں بدعات سے منع کرنے میں لوگوں کو وحشت ہو تو یوں کہنا چاہیئے کہ تم سب کچھ کرو مگر ان "مُلاؤں" کو کچھ مت دو۔ اللہ کے واسطے فاتحہ دلوایا کرو۔ پھر دیکھ لینا کہ یہی لوگ بدعات کو منع کرنے لگیں گے کیونکہ ملنا ملانا تو کچھ رہیگا نہیں اور فاتحہ کیلئے جگہ جگہ سے گھسیٹے جاویں گے بدعات خود چھوٹ جاویں گی"۔

علماء پر اختلاف کا الزام اور انہیں اتفاق کا غلط طریقہ : آج عوام میں ہر طرف اس بات کو لیکر رونا رویا جاتا ہے کہ علماء کے اختلافات نے سب کو منتشر کر دیا ہے۔ مضطرب کر دیا ہے۔ یہ

لوگ چاہتے ہیں کہ اچھے بُرے صحیح غلط سب کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے کو سمجھ کر اور ایک دوسرے کا لحاظ رکھ کے آپس میں صلح کر لینا چاہئیے، اس لئے کہ "اختلاف" بہت ہی بُری چیز ہے۔ عوام کیا بلکہ بہت سے خواص بھی اسی ذہنیت کے حامل ہیں۔ ان کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ جہاں بھی حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوگا اختلاف ضرور پیدا ہوگا۔ "اختلاف" بذات خود کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ باطل پر رہتے ہوئے ناحق اختلاف غلط چیز ہے۔ اہل حق کو اختلاف کا مکمل حق حاصل ہے۔ اگر اسی ضابطہ پر عمل کیا جائے کہ اختلاف بذات خود بُری چیز ہے اس سے مکمل پرہیز کرنا چاہئیے تو ہم زندگی کے کسی بھی شعبہ میں صحیح طور پر نہیں چل سکیں گے اور دوسروں کے استحصال کا شکار بنتے چلے جائیں گے۔ ظاہر سی بات ہے کہ کوئی آدمی اپنے مفادات کیلئے ہمارا استحصال کرے گا، صحیح نظریات کا مذاق اڑائے گا تو کیا ہم صرف یہ سوچ کر کہ "اختلاف" بُری چیز ہے اس کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے دیں گے؟ یا پھر اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کو روکیں گے؟ بالکل اسی طرح علماء کا بھی معاملہ ہے۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: "بعض تو اہل حق ہی سے کہتے ہیں کہ آپ کو دوسروں سے اتفاق کر لینا چاہئیے اور بعض ایسے بھی ہیں جو دونوں سے کہتے ہیں کہ دونوں کو باہم اتفاق کر لینا چاہئیے۔ یہ لوگ اہل حق کو بھی اہل باطل سے اختلاف کرنے کیوجہ سے مجرم سمجھتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ اتفاق رکھنا چاہئیے، خواہ تو وہ ان کی بات مان لیں اگر وہ نہ مانیں تو پھر ان کو ان کی بات مان لینا چاہئیے کیونکہ اختلاف مذموم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو پھر آج سے اگر کاشتکار آپ کی زمین کا لگان نہ دے تو اس کی نالش نہ کرنا کیونکہ نالش کرنا نزاع ہے اور نزاع مطلقاً مذموم ہے اور اگر وہ گھر مانگے اور اس وقت اس سے پوچھا جائے کہ تو ہمارا گھر کیوں لیتا ہے اور وہ یہ جواب دے کہ ناحق لیتا ہوں اور اگر آپ نے نہ دیا تو مجھ میں آپ میں اتفاق نہ رہیگا تو آپ کو چاہئیے کہ نزاع سے بچنے کیلئے اپنا گھر اس کو دیدیں اور اگر وہ زمین دبالے تو اختلاف سے بچنے کیلئے اس کو زمین بھی دیدو"۔

علماء سے دینی و تبلیغی اور اشاعتی کام لینے کا آئیڈیل طریقہ: موجودہ معاشرے میں علماء کرام کیلئے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن مسئلہ "معاش" کا ہے۔ ایک عالم جب کسی ادارے

سے تیار ہو کر نکلتا ہے تو اس کے سینہ میں ملت اور قوم کی اصلاح "خدمت دین" اور اشاعت اسلام کا جذبہ بالکل تازہ اور جوان ہوتا ہے۔ مگر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اس کا سامنا ان معاشی مسائل سے ہوتا ہے جن سے کسی بھی انسان کو فرار نہیں، نتیجتاً وہ ان مسائل کو سلجھانے میں جو مشغول ہوتا ہے تو دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ تک وہ مسائل ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ ایسے ماحول میں اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تبلیغ اسلام 'اصلاح امت' درس و تدریس 'تصنیف و تالیف کا کام بھی دلجمعی و یکسوئی کے ساتھ کرے بالکل بے جا اور غلط ہے۔ عملی و اصلاحی کام بالکل مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ان کیلئے عام کاموں سے زیادہ یکسوئی و دلجمعی کی ضرورت پڑتی ہے اور کسی بھی الجھن و پریشانی کے عالم میں یہ کام نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ اس کیلئے لازم ہے کہ ان علماء کو معاش کی طرف سے بے فکر بنا دیا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی زندگی عزت و وقار کے ساتھ گزرنے لگے پھر ان سے اصلاح امت اور تبلیغ و اشاعت کا کام لیا جائے۔ علامہ تھانویؒ فرماتے ہیں: "علماء سے کام لینے کی صورت یہ ہے کہ پہلے ان کے اہل و عیال کے نفقہ کا بندوبست کر دیا جائے کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کے پاس روپیہ نہیں ہے اس وقت ہر شخص کسی نہ کسی حیلہ میں لگا ہوا ہے جس میں ان کو معقول تنخواہ مل رہی ہے جس سے ان کے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ اب ان کو اس حیلہ سے چھڑا کر تبلیغ میں جبھی لگا سکتے ہیں جبکہ پہلے ان کی تنخواہ کا انتظام ہو جائے اس کی ایک سہل تدبیر یہ ہے کہ ہر ضلع میں ایک امیر یا امراء و غرباء سب مل کر ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ کر لیں۔ اس صورت میں کسی انجمن یا مرکز سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ بس مبلغ اور مبلغ دو سے واسطہ ہوگا۔ اگر اس کا انتظام ہو جائے تو کام نہایت اطمینان سے ہوتا رہیگا اور دواماً ہوتا رہیگا۔ ہر چند کہ ایک مرکز کا سب کو تابع ہونا بہت اچھا ہے مگر دشواری تو یہی ہے کہ مرکز کس کو بنایا جائے" (۱۸)۔

بے جا تشہیر اور ہنگامہ آرائی: ہم مسلمانوں کا موجودہ المیہ ہے کہ کوئی بھی کام کرتے ہیں تو ہنگامہ آرائیوں 'جوشیلے نعروں اور بے جا پبلسٹی کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ جہاں کسی کام کا ارادہ ہوا کہ تنظیمیں بنتی ہیں 'اراکین بنائے جاتے ہیں 'اخباروں میں خبریں اور بیانات دیئے جاتے ہیں 'پوسٹریں لگائے جاتے ہیں 'پمفلٹ بانٹے جاتے ہیں مگر چند دنوں بعد "ٹائیں ٹائیں فش" سب

کے سب ٹھنڈے! حالانکہ ہونا یہ چاہئیے کہ سب سے پہلے خلوص و بے لوثی کے ساتھ ٹھوس اقدامات کئے جائیں، مستقل محنت اور عمل پیہم کا نمونہ پیش کرتے ہوئے پبلسٹی کے ذرائع کو استعمال میں لایا جائے۔ وہ بھی حسب ضرورت اور عتدال کی حد تک۔ ہم لوگ ہوش کے دامن کو چھوڑ کر جوش ہی میں مگن آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب جوش ٹھنڈا پڑتا ہے تو سارا معاملہ ٹھنڈا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ وقتی اشتعال میں آکر جو اقدمات کئے جاتے ہیں وہ زیادہ جاندار اور دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ علامہ تھانویؒ نے اس معاملہ پر اپنی کئی تقاریر میں افسوس کا اظہار کیا۔ فرماتے ہیں: "صاحبو! میں کیا کہوں کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے اپنے ہی گھر کا راز کھلتا ہے۔ آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ اجتماعی کام میں ہمیشہ گڑبڑ ہوتی ہے جس کام میں جتنا زیادہ اجتماع ہوگا اتنا ہی جھگڑا ہوگا۔ ہم لوگوں نے اپنی حالت سے دوسروں کو دکھلا دیا ہے کہ ہم میں اجتماع کے ساتھ کام کرنے کی بالکل قابلیت نہیں۔ کیونکہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ جس کام میں جتنا زیادہ ہنگامہ ہوتا ہے جو لازم اجتماع سے ہے وہ جلدی ہی ختم بھی ہو جاتا ہے بقا اسی کام کو ہوتا ہے جو تدریج کے ساتھ بڑھے اور اعتدال کے ساتھ چلتا رہے جو لوازم انفراد سے ہے، ورنہ وہی حالت ہوتی ہے کہ جیسے بازی گر شعبدہ سے آم کا درخت لگاتے ہیں کہ وہ ذرا سی دیر میں پیدا بھی ہو جاتا ہے اور فوراً ہی پھل بھی لے آتا ہے اور جلدی ہی فنا بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ ابتداء ہی سے بڑی لمبی چوڑی تجویزیں کرتے ہیں اور انجمن اور عہدہ دار مقرر کرتے اور جلسے کرتے ہیں، ان سے کام کچھ نہیں ہوتا۔ چار دن کے بعد سب باتیں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں"۔ آگے فرماتے ہیں: یاد رکھو جوش سے کام نہیں چلتا بلکہ ہوش سے کام چلتا ہے۔ پس جوش اور ہنگامہ کی ضرورت نہیں، ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کا وہی طریقہ ہے کہ جس سے جتنا ہو سکے بس اللہ کا نام لیکر شروع کردے۔ نہ انجمن کی ضرورت ہے نہ سیکرٹری کی۔ بس دو چار آدمی جتنے متفق ہو سکیں، کام شروع کر دیں اور اگر کوئی متفق نہ ہو تو تم اکیلے ہی کام شروع کر دو" (۱۹)۔

قرآن کریم سے سائنسی مسائل کا استنباط: ہم مسلمان اس بات کو بیان کر کے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ آج جو سائنسی ترقیاں ہو رہی ہیں ان سب کا ذکر پہلے ہی سے قرآن میں موجود ہے اور

یہ کہ تمام سائنسی ترقیوں کے کلیوز (اشارے) قرآن میں موجود ہیں۔ مگر علامہ تھانویؒ اس کے سخت خلاف تھے اور انہوں نے اس موضوع پر جو باتیں پیش کی ہیں ہم انہیں نظرانداز بھی نہیں کر سکے انکا کہنا تھا کہ قرآن کریم رشد و ہدایت کی کتاب ہے اسکو اسی مبارک حیثیت کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے اس میں طب کے اور موجودہ سائنس کے مسائل تلاش کرنا نادانی کی بات ہوگی۔ پھر فرماتے ہیں: "دوسری خرابی یہ ہے کہ سائنس کے مسائل ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ پرانی سائنس آجکل گرد ہو رہی ہے۔ حال کی سائنس میں خود اختلاف ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ جو محققین پیدا ہوں انکی تحقیقات اسکے بالکل خلاف ہوں تو آج اگر کسی سائنسی کے مسئلہ کو قرآن مجید کی تفسیر بنادیا اور یہ ثابت کر دیا اور تسلیم کر لیا کہ یہ مدلول قرآنی ہے تو کل کو جبکہ ان مسائل کی غلطی ثابت ہو جائے گی، ایک ادنیٰ سا ملحد اس کو غلط ثابت کر کے پھر اس سے قرآن مجید کا نعوذ باللہ خلاف واقع کے ہونا دکھلادے گا اور مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش ہو جاویگی کہ تمھارے مذہب کی یہی کتاب ہے جسمیں خلاف واقع مسائل ہیں (۲۰)۔ تیسری خرابی اور ہے اور اسکو میں بے غیرتی سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مسائل کو مدلول قرآنی بناتے ہیں گویا اہل یورپ کو احسان جتلانے کی گنجائش دیتے ہو کہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بدولت آج قرآن مجید کے معنی معلوم ہوئے۔ اگر ہم ان مسائل کی تحقیق نہ کرتے تو محمد ﷺ سے لیکر اس وقت تک کسی کو قرآن مجید کا پتہ نہ لگتا" (۲۱)۔

گناہوں کی وقتی لذت دائمی تکلیف کی موجب ہے : "گناہوں کی لذت" ایک ایسی سحر انگیز اور نشیلی چیز ہے جو ابن آدم کو بار بار اپنے رب عظیم کی نافرمانی پر اکساتی ہے۔ وہ اس کی خاطر اپنے کھلے دشمن شیطان سے بھی دوستی اور سمجھوتہ کر لیتا ہے، پھر جب بھی اس میں کچھ اصلاح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ شیطان کی طرف سے فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں صحیح احکامات پر عمل کر کے زندگی گزاروں گا تو ان لذتوں سے محروم ہو جاؤں گا، جن سے ابھی مستفید ہو رہا ہوں۔ چنانچہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ ابھی اور ان لذتوں کا مزا لے لوں آخر میں توبہ کر لوں گا۔ جبکہ وہ اپنے آخری وقت کی تعین سے بے خبر رہتا ہے اور اس طرف سے بھی اس کا ذہن غافل ہو جاتا ہے کہ یہ لذتیں فانی ہیں، وقتی ہیں جبکہ انکی سزا دائمی اور بے حد تکلیف دہ ہے۔ فرمان تھانویؒ ہے: "گناہوں

میں مزا پانا دل کی بیماری کی علامت ہے جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے کو نیم کے پتے میٹھے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ مٹھائی موت کا پیام لاتی ہے۔ ابتداء میں اگر اصلاح کی کوشش کی جائے تو سہل ہے ورنہ پھر تو مثل بخار کے مریض کے ہے جس کو بد پرہنریوں سے دق ہو گئی ہو اور پھر بھی اس نے کچھ پروانہ نہیں کی، آخر کو درجہ رابعہ میں پہنچ کر لاعلاج ہو گئے۔ اسی طرح جو لوگ گناہ پر برابر اصرار کرتے ہیں اور مالک کی طرف رجوع نہیں کرتے ان کے دلوں پر مہر ہو جاتی ہے جس کے سبب پھر توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہے :

"ختم الله علی قلوبهم وعلیٰ سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة" (البقرہ)

اگرچہ گناہ فی الوقت مزیدار معلوم ہوتا ہے لیکن وہ مزہ فوری و فانی ہے اور اس کی سزا دائمی و باقی ہے۔ دنیا کے مزے بالکل خواب و خیال ہیں انسان کو چاہئے کہ ان کے واسطے اپنی آخرت کی دولت و عزت کو نہ برباد کرے "(۲۲)۔

علامہ تھانویؒ کے خطبات کی خصوصیات کا تعلق ان کے غیر معمولی علم و فضل، زہد و تقویٰ، تجربات و مشاہدات اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے گہری واقفیت سے ہے اور یہاں پر بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے، انکے خطبات کے بنیادی مآخذ میں سرفہرست قرآن و حدیث ہیں پھر اسلامی تاریخ، اسلام کا علمی ورثہ اور سلف صالحین کے کارنامے ہیں، وہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن و سنت کی روشنی میں کہتے ہیں، مخاطب کی سطح اور اسکے مزاج کو مد نظر رکھ کر کہتے ہیں۔ انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے انہیں بخوبی واقفیت حاصل تھی جسکی بناء پر ان کی پیشکش کا انداز ہر ایک کیلئے پرکشش اور قابل غور ہوتا۔ انکی تقاریر میں ہم کو ظرافت و مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے جو عوام کو باوجود انکی طوالت کے ان میں یکساں دلچسپی لینے پر مجبور کرتا تھا۔

علامہ کے خطبات میں ایک سنجیدہ، باوقار اور ہلکی پھلکی و دلکش فضاء پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے سامعین کو ذمہ دارانہ طور پر فکر پر آمادہ کرتے ہیں اور ان کو انکی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں۔ انکے خطبات تصنع و بناوٹ، ظاہری شان و شوکت، غیر ضروری الفاظ کے استعمال اور عوام کو خواہ مخواہ اپنی صلاحیتوں سے مرعوب کرنے کے ہتھکنڈوں سے یکسر پاک ہیں۔ جن موضوعات کو انہوں

نے اپنے خطبات میں چھیڑا اور انکا حل پیش کیا ان میں سے بیشتر آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ویسے ہی اہم اور مفید ہیں جیسے انکے اپنے زمانے میں رہے ہوں گے۔ خاص طور پر وہ خطبات جو علماء کرام اور بزرگان ملت کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ انکے خطبات کی زبان عام طور پر سہل اور سادہ ہے مگر بعض جگہوں پر پُر شکوہ اور اس حد تک ثقیل ہو جاتی ہے کہ اسے صرف خواص ہی سمجھ سکتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ "خطبات حکیم الامت" عوام و خواص دونوں کی اصلاح کا ایک ایسا زبردست ذریعہ ہیں جنکو سامنے رکھ کر موجودہ دور میں بھی اصلاح امت اور اشاعت اسلام کے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ عوام کے ساتھ ساتھ خواص بھی اسکے مطالعہ اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ ہم کہاں تک اپنے فرائض کی ادائیگی میں کامیاب ہیں کہ علامہ تھانویؒ کی شعوری اور لاشعوری دونوں قسم کی بیماریوں پر گہری نظر تھی اور انہوں نے اپنے خطبات میں اپنے وسیع مطالعہ، غیر معمولی علم و فضل اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں انکا علاج بھی پیش کیا۔

﴿حواشی﴾

(۱) خطبات حکیم الامت، زمزم بکڈپو دیوبند، ۱۹۹۶ء: ج۱ص ۱۵۷۔۱۵۸ (۲) خطبات حکیم الامت، ج۱ص ۳۶۳۔۳۶۴ (۳) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۴۰ (۴) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۸۶ (۵) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۱۳۵ (۶) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۴۱۲ (۷) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۴۵۹ (۸) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۴۰ (۹) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۴۴۔۳۴۵ (۱۰) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۶۳ (۱۱) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۶۷ (۱۲) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۱۵ (۱۳) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۲۲ (۱۴) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۲۵ (۱۵) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۵۳ (۱۶) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۲۲۶۔۲۲۷ (۱۷) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۳۳۱ (۱۸) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۲۰۲۔۲۰۳ (۱۹) خطبات حکیم الامت: ج۱ص ۲۲۴۔۲۰۶ (۲۰) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۲۲۴۔۲۰۶ (۲۱) خطبات حکیم الامت: ج۲ص ۲۲۷ (۲۲) خطبات حکیم الامت: ج۳ص ۱۱۰۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خط وکتابت کرتے وقت خریداری
نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔